معاصر اُردو ناول میں طبقاتی، ثقافتی اور سماجی مسائل کی عکاسی

Reflection of Class, Cultural, and Social Issues in Contemporary Urdu Novel

محمد اکرم شاد
لیکچرار، شعبہ اُردو، ورچوئل یونیورسٹی، لاہور

Abstract:
The contemporary Urdu novel has emerged as a significant literary medium for addressing diverse social realities of the twenty-first century. This study investigates the ways in which modern Urdu novelists depict class divisions, cultural values, and social problems within their narratives. It focuses on the representation of economic disparity, cultural hybridity, gender inequality, political instability, and the clash between tradition and modernity. Through a critical analysis of selected contemporary Urdu novels, the research underscores how fiction serves as both a mirror and a critique of society, articulating the voices of marginalized groups while questioning dominant power structures. Furthermore, the study highlights the role of the Urdu novel in shaping social awareness, fostering dialogue on cultural identity, and contributing to the broader discourse of resistance and reform. By situating the contemporary Urdu novel within the context of globalization and postcolonial realities, this paper emphasizes its function as a dynamic space where literature and society intersect to reveal the challenges, tensions, and aspirations of the modern age.

Keywords: Contemporary Urdu Novel, Social Issues, Cultural Identity, Gender Inequality, Tradition and Modernity, Globalization,

ادب کو ہمیشہ سے معاشرتی زندگی کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں ادبی اصناف نے نہ صرف انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے بلکہ ان عوامل کو بھی اجاگر کیا ہے جو فرد اور سماج کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ ان اصناف میں ناول کو ایک ایسی جامع صنف کا درجہ حاصل ہے جس میں زندگی کے مختلف پہلو نہ صرف کہانی اور کرداروں کے ذریعے بیان ہوتے ہیں بلکہ تہذیبی، ثقافتی اور سماجی عوامل بھی اپنے تمام تر رنگوں اور تضادات کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کو محض تفریحی یا تخیلاتی صنف کے طور پر دیکھنا ناانصافی ہے؛ یہ دراصل ایک زندہ دستاویز ہے جو اپنے عہد کی تاریخ، ثقافت، سیاست، معیشت اور اخلاقیات کی عکاسی کرتی ہے۔

اردو ناول کا ارتقائی سفر انیسویں صدی سے شروع ہوتا ہے، جب سماج میں جدیدیت اور نوآبادیاتی اثرات کے نتیجے میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ابتدائی ناول نگاروں نے اصلاحی مقصد کے تحت طبقاتی تفریق، سماجی برائیوں اور معاشرتی عدم توازن پر روشنی ڈالی۔ بیسویں صدی میں ناول نے مزید ارتقا پایا اور حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تجزیے اور وجودی مسائل پر بھی توجہ دی گئی۔ تاہم اکیسویں صدی کا اردو ناول اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں طبقاتی، ثقافتی اور سماجی مسائل کو زیادہ شدت اور کثیر جہتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ طبقاتی مسائل معاصر اردو ناول میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام، معاشی ناہمواری، امیر اور غریب کے درمیان بڑھتا ہوا خلا، متوسط طبقے کی بے بسی اور نچلے طبقے کی محرومیاں ایسے موضوعات ہیں جن پر کئی معاصر ناول

نگاروں نے توجہ دی ہے۔ یہ ناول معاشی اور سماجی ڈھانچے کی اس حقیقت کو سامنے لاتے ہیں کہ طبقاتی تفریق محض اقتصادی مسئلہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی اور نفسیاتی مسئلہ بھی ہے، جو انسانی رویوں اور معاشرتی تعلقات کو براہ راست متاثر کرتا ہے۔ ثقافتی مسائل کی عکاسی بھی معاصر اردو ناول کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ گلوبلائزیشن، مغربی تہذیبی اثرات، مشرقی اقدار کی زوال پذیری، زبان و شناخت کا بحران، ہجرت اور جلاوطنی جیسے موضوعات ثقافتی سطح پر ناول نگاروں کے لیے اہم سوالات پیدا کرتے ہیں۔ معاصر اردو ناول اس بات پر غور کرتا ہے کہ کس طرح ایک فرد اپنی تہذیبی اور لسانی شناخت کو بچانے کی جدوجہد کرتا ہے اور کس طرح معاشرتی دباؤ اور جدید دنیا کے تقاضے اس شناخت کو کمزور یا مضبوط کرتے ہیں۔

اسی طرح سماجی مسائل کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں عورت کے حقوق، صنفی مساوات، خاندانی نظام کی تبدیلی، اخلاق اقدار کا بحران، معاشرتی ناانصافیاں، بدعنوانی، شدت پسندی اور سیاسی عدم استحکام جیسے موضوعات شامل ہیں۔ ناول ان مسائل کو محض بیانیہ کے طور پر پیش نہیں کرتا بلکہ ان کے اسباب اور نتائج پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اس طرح یہ ایک تنقیدی اور تجزیاتی زاویہ فراہم کرتا ہے جو قاری کو محض کہانی سننے کے بجائے اس پر غور کرنے اور سماجی تبدیلی کی ضرورت کو سمجھنے پر آمادہ کرتا ہے۔ معاصر اردو ناول کو اگر ایک وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو یہ نہ صرف مقامی سماجی مسائل کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ اسے عالمی تناظر میں بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی تنقید کے حوالے سے بھی یہ ناول اہم ہیں کیونکہ ان میں طاقت، شناخت، طبقاتی کشمکش اور تہذیبی تصادم کے وہ پہلو سامنے آتے ہیں جو جدید دنیا کے ہر معاشرے میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ راجندر ناتھ شیدا "ادب فکر اور سماج" میں لکھتے ہیں:

> تخلیقی ادب سماجی حقائق سے تاثرات حاصل کر کے اور ان تاثرات میں اپنے مخصوص ذہنی عمل سے اپنی شخصیت کا رنگ بھر کر انہیں زبان کے سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ اس کا نقطہ آغاز ادب ہوتا ہے اور منتہا زندگی اور سماج۔"(۱)

سماج دراصل وہ بنیادی مسکن ہے جہاں انسان اپنی پیدائش سے لے کر آخری سانس تک زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ مسکن محض ایک رہائشی جگہ نہیں بلکہ ایک ایسا پیچیدہ اور متحرک نظام ہے جس میں انسانی رویے، تعلقات، اقدار اور ضروریات ایک دوسرے کے ساتھ گہرے ربط میں پروئے جاتے ہیں۔ انسان اپنی روزمرہ زندگی کے تجربات، مشاہدات اور واردات کو محض اپنے اندر محفوظ نہیں رکھتا بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انہیں مختلف ادبی اصناف کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ادب اس لحاظ سے انسانی سماج کی زندہ اور جیتی جاگتی تصویر ہے جو فرد اور معاشرے کے باہمی رشتوں اور کشمکش کو زبان اور اسلوب کی صورت میں محفوظ کرتا ہے۔ موجودہ صدی کو بلاشبہ اردو ناول کی صدی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اردو ادب کی گزشتہ دو صدیوں پر نگاہ ڈالیں تو ناول کی صنف نے رفتہ رفتہ اپنی ایسی حیثیت قائم کر لی ہے جو آج اسے اردو نثر کی سب سے طاقتور اور ہمہ گیر صنف کے طور پر تسلیم کرواتی ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر تک اردو ناول نے مختلف تجربات، رجحانات اور موضوعات کے ذریعے ایک مضبوط بنیاد رکھ دی تھی، اور اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اس بنیاد پر نئے اور توانا تخلیقی ڈھانچے تعمیر ہونے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صدی کے ابتدائی عشروں سے لے کر آج تک اردو افسانوی ادب میں مسلسل اور کثرت سے ناول سامنے آ رہے ہیں، اور یہ سلسلہ محض برقرار ہی نہیں بلکہ مزید وسعت اور تنوع کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔

ناول اپنی فطرت اور ساخت کے اعتبار سے دیگر اصناف کے مقابلے میں زیادہ جامع ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک وسیع کینوس پر پیش کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اپنے عہد کے گوناگوں مسائل، حالات اور رجحانات کی سب سے زیادہ سچی اور ہمہ جہت عکاسی کا مؤثر وسیلہ قرار دیا جاتا ہے۔ معاصر اردو ناول اپنے قاری کو محض ایک کہانی نہیں سناتا بلکہ اس کے گرد و پیش کے معاشرتی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی حالات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری اپنی روزمرہ زندگی کی جھلکیاں اس میں صاف طور پر محسوس کرتا ہے۔ اکیسویں صدی کے ناول نگاروں نے خاص طور پر طبقاتی تفاوت، ثقافتی کشمکش اور سماجی بحرانوں کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے ہاں فرد کی تنہائی، عورت کی جدوجہد، غربت اور بے روزگاری کے مسائل، اقدار کی زوال پذیری، سماجی ناہمواری اور سیاسی عدم استحکام جیسے موضوعات نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ناول قاری کو نہ صرف سماج کا تماشائی بناتے ہیں بلکہ اسے اپنے عہد کے مسائل پر غور و فکر کرنے اور ان کے ممکنہ حل تلاش کرنے پر بھی آمادہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نعیم انیس "اکیسویں صدی میں اردو ناول" میں لکھتے ہیں:

> "اردو ناول کے آغاز سے اب تک جتنے ناول بھی لکھے گئے ہیں، ان کی تدریس سے ہم نہ صرف اس عہد سے بلکہ اس عہد کے تمام تر داخلی و خارجی حالات سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ اردو ناولوں نے ہر دور میں انسانی زندگی، زمانے کی گردشیں، شکست و ریخت کے سلسلے، سیاسی و سماجی مسائل، عروج و زوال کی داستانیں، تغیرات و تبدل، روایتوں کی پاسداری، تہذیب و ثقافت کی عکاسی، ادبی تحریکات کے احرات، اقتدار کی سازشیں اور زمانے کے بدلتے ہوئے رویے کی عکاسی کچھ اس انداز سے کی ہے کہ ان میں ہمارا پورا معاشرہ جلوہ گر نظر آتا ہے۔" (۲)

اکیسویں صدی کو دنیا کی تاریخ میں ایک ایسی صدی کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جس نے ہر میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اسے بجا طور پر ترقی یافتہ صدی کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس دور میں سائنس و ٹیکنالوجی، طب، تعلیم، معیشت، مواصلات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سمیت زندگی کے ہر شعبے نے برق رفتاری کے ساتھ ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ انسانی زندگی کے تمام شعبے نئی ایجادات، سہولتوں اور امکانات کے ذریعے ایک نئی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ یہ ترقی محض مادی پہلوؤں تک محدود نہیں بلکہ فکری، تہذیبی اور معاشرتی سطح پر بھی گہرے اثرات مرتب کر رہی ہے۔ ایسے میں ادب، جو ہمیشہ زندگی کے ساتھ چلتا ہے، اس تیزی سے بدلتے ہوئے عہد سے کیسے الگ رہ سکتا تھا؟ چنانچہ اکیسویں صدی کا اردو ادب، بالخصوص اردو ناول، اپنے عہد کے حالات و واقعات، ترقیوں اور تغیرات کو نہایت باریک بینی سے اپنے دامن میں سمیٹنے میں کامیاب ہوا ہے۔

اکیسویں صدی میں تخلیق کردہ اردو ناول اپنے موضوعات اور اسالیب کے اعتبار سے نہایت وسعت اور تنوع کے حامل ہیں۔ ان میں سماجی مسائل کی جھلک نمایاں ہے جو فرد اور معاشرے کے باہمی تعلقات کو واضح کرتی ہے۔ سیاسی موضوعات بھی اس صدی کے ناولوں میں بھرپور انداز سے سامنے آتے ہیں جن میں ریاستی نظام کی کمزوریاں، عوامی جدوجہد، طاقت کی کشمکش اور جمہوری اقدار کے بحران کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی طرح معاشی پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ ناول غربت، بے روزگاری، سرمایہ دارانہ نظام اور طبقاتی ناہمواری جیسے مسائل کو موضوع بناتے ہیں۔ سوانحی اور اصلاحی موضوعات بھی اکیسویں صدی کے اردو ناولوں کا اہم حصہ ہیں۔ کئی ناولوں میں فرد کی ذاتی جدوجہد، اس کی داخلی کیفیات اور نفسیاتی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے تاکہ انسانی شخصیت کے مختلف رنگ قاری کے سامنے آئیں۔ اصلاحی اور اخلاقی موضوعات کے ذریعے ناول نگار نے معاشرتی برائیوں کو اجاگر کرتے ہوئے قاری کو ایک بہتر

سماج کی تشکیل کی ترغیب دی ہے۔ اسی طرح تہذیبی و ثقافتی موضوعات کے ضمن میں روایتی اقدار، جدید رویوں، مشرق و مغرب کی کشمکش، ہجرت اور شناخت کے بحران کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان ناولوں کی سب سے بڑی خصوصیت موضوع کی انفرادیت، اسلوب کی دلکشی اور طریقۂ اظہار کی آزادی ہے۔ اکیسویں صدی کا ناول حقیقت کے ادراک کے ساتھ ساتھ فنی تجربات سے بھی مالامال ہے۔ جدید بیانیہ تکنیک، کثیر لسانی اظہار، علامتی و تجریدی اسالیب اور بین المتونی حوالہ جات نے اردو ناول کو نہ صرف عصری سطح پر مضبوط کیا ہے بلکہ عالمی ادب کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی کیا ہے۔

انسانی حیات اپنی فطرت میں کشمکش، شکست و ریخت، اتار چڑھاؤ، تضادات اور انقلابات کا مجموعہ ہے۔ ان تمام کیفیتوں اور تغیرات کے اظہار کا سب سے مؤثر وسیلہ ناول ہے کیوں کہ ناول میں معاشرہ اور فرد، ذات اور کائنات، داخلی اور خارجی دونوں عناصر اپنے مکمل تنوع کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو اکیسویں صدی کے اردو ناول کو محض ایک تخلیقی بیانیہ نہیں بلکہ ایک سماجی و فکری دستاویز بنا دیتی ہے جو قاری کو اپنے عہد کے مسائل سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ اسے فکری بیداری اور تخلیقی حسیّت بھی عطا کرتی ہے۔ سماج اور ادب آپس میں گہرے رشتے سے منسلک ہیں۔ ایک ادیب سماج میں پیدا ہوتا ہے اور اسی سماج کے واقعات کے مشاہدے اور مطالعے سے ہی تخلیق کرتا ہے۔ سماج سے کنارہ کش ہو کر کوئی بھی ادیب ادبی خدمات سرانجام نہیں دے سکتا اس لیے ایک ادیب نہ صرف اپنے زمانے کا ترجمان ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے زمانی کی تاریخ کا عینی شاہد بن کر اسے اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ ادب اور سماج چونکہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اس لیے سماجی مسائل کی بہترین عکاسی ادب کے ذریعے کی جاتی ہے۔ زندگی کے وسیع و عریض کینوس کی وضاحت ادب کی جس صنف میں ملتی ہے اسے ناول کہتے ہیں۔ اردو ادب میں دیگر مستعمل ادبی اصناف کی طرح ناول کی آمد بھی انگریزی ادب سے ہوئی۔

اردو ادب کی تاریخ میں ڈپٹی نذیر احمد کو پہلا باقاعدہ ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ایسے موضوعات کو اپنایا جو براہِ راست سماج کی اصلاح اور تعلیم و تربیت سے تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کے ابتدائی ناول فنی اعتبار سے کئی خامیوں اور سادگی کے حامل دکھائی دیتے ہیں لیکن مقصدیت ان کے ہاں بنیادی اہمیت رکھتی تھی۔ نذیر احمد کے ناولوں میں اصلاحِ معاشرہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے گھریلو زندگی، عورت کی تعلیم، خاندانی رشتوں کی اہمیت اور مذہبی و اخلاقی اقدار کے حوالے سے اپنے عہد کے مسائل کو نہایت سلیقے اور سادگی سے بیان کیا۔ ان کے ناولوں نے اردو ناول نگاری کے لیے ایک بنیاد فراہم کی جس پر بعد کے ناول نگاروں نے اپنے تخلیقی تجربات استوار کیے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے بعد عبدالحلیم شرر نے اردو ناول کو ایک نیا رخ دیا۔ انہوں نے تاریخی اور سماجی ناول نگاری کے ذریعے نہ صرف ماضی کی داستانوں اور تہذیبی ورثے کو زندہ کیا بلکہ معاصر سماج کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی۔ شرر کے ناولوں میں تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور سماجی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا، جس سے اردو ناول کی وسعت اور افادیت میں مزید اضافہ ہوا۔ یوں دیکھا جائے تو اردو ناول نگاری کو اب تقریباً ڈیڑھ صدی یعنی ایک سو چالیس برس سے زیادہ کا سفر طے ہو چکا ہے۔ اس طویل مدت میں بے شمار ناول منظرِ عام پر آئے جن میں معیاری اور غیر معیاری دونوں طرح کی تخلیقات شامل ہیں۔ قارئین نے اپنی فکری، جمالیاتی اور ذوقی بنیادوں پر ان ناولوں کو پسند یا ناپسند کیا۔ تاہم ایک بات مشترک رہی کہ کم و بیش ہر ناول میں اپنے دور کے معاشرتی مسائل، اقدار اور رویوں کا عکس ضرور نظر آتا ہے۔

انسانی زندگی کی رفتار جتنی تیز اور مختصر ہوتی جا رہی ہے، اتنے ہی اس کے مسائل میں وسعت اور پیچیدگی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ یہی پیچیدگی ناول کو وہ کینوس فراہم کرتی ہے جس پر زندگی کی رنگارنگی، تضادات اور کشمکش کو نمایاں کیا جا سکتا ہے۔ سماجی اور مذہبی

اقدار کی بقا ہو یا سیاسی و ثقافتی تشخص کا سوال، طبقاتی ناہمواری ہو یا سیاسی شعور کی بیداری، معیشت کی کشمکش ہو یا انسانی رشتوں کی چپقلش، عورت کی شناخت اور تانیثیت کا مسئلہ ہو یا سرمایہ اور دولت کی ہوس معاصر اردو ناول ان تمام موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ اکیسویں صدی کے اردو ناول نگاروں نے خاص طور پر اس بات کو محسوس کیا کہ جدید عہد میں انسانی زندگی بظاہر آسان لیکن دراصل زیادہ الجھی ہوئی ہے۔ نئی ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی کے باوجود انسان داخلی تنہائی، اخلاقی بحران، ثقافتی الجھنوں اور معاشرتی ناانصافیوں سے دوچار ہے۔ یہی وہ مسائل ہیں جنھیں معاصر ناول نگاروں نے اپنے فن میں برتا اور حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ علامتی و استعاراتی اسالیب کے ذریعے پیش کیا۔ اس طرح اردو ناول نے نہ صرف زندگی کے خارجی مسائل کو بیان کیا بلکہ انسانی وجود کے داخلی تضادات کو بھی اجاگر کیا۔ پروفیسر انور پاشا "ہم عصر اردو ناول ایک مطالعہ" میں لکھتے ہیں:

> "معاصر ناولوں کی ایک نمایاں صفت یہ ہے کہ عصری معاشرے کی خارجی حقیقتوں کا ہی احاطہ نہیں کرتے بلکہ خارجی وسیلے کے تجربے سے ہماری ذات کے نہاں خانے میں اتر کر ہماری خوابیدہ حس کو بے دار کرنے اور ہمارے ساکت وجدان میں تحرک پیدا کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔"(۳)

اکیسویں صدی میں اردو ناول نے معاشرتی مسائل کو کس طرح موضوع بنایا اور ادیبوں نے بدلتے ہوئے سماجی و ثقافتی حالات کو اپنے فن میں کس طور پیش کیا۔ اس سلسلے میں دو اہم ناولوں کو زیرِ مطالعہ لایا گیا ہے: علی اکبر ناطق کا ناول **"کماری والا"** اور بانو قدسیہ کا شہرۂ آفاق ناول **"راجہ گدھ"**۔ ان دونوں ناولوں میں اپنے عہد کے سماجی تضادات، انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں، اخلاقی بحران اور معاشرتی اقدار کے بکھرتے ہوئے ڈھانچے کی عکاسی نمایاں طور پر ملتی ہے۔ ادب اور معاشرے کا رشتہ اٹوٹ اور ناقابلِ انکار ہے۔ معاشرہ ادیب کو مواد فراہم کرتا ہے اور ادیب اس مواد کو اپنی فنی بصیرت، تخلیقی صلاحیت اور مشاہدے کی گہرائی کے ساتھ ایک ادبی تخلیق کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بڑا ناول اپنے دور کی مکمل تصویریں پیش کرتا ہے۔ اکیسویں صدی چونکہ سائنسی، سماجی اور تہذیبی اعتبار سے ایک انقلابی صدی ہے، اس میں فرد کی زندگی میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ان تبدیلیوں نے جہاں انسانی زندگی میں آسانیاں پیدا کی ہیں وہیں اقدار کے زوال، اخلاقی بحران، طبقاتی تقسیم، معاشی مسائل، سماجی بے چینی اور ثقافتی انتشار کو بھی جنم دیا ہے۔

علی اکبر ناطق کے ناول **"کماری والا"** میں طبقاتی کشمکش، غربت و امارت کا فرق، طاقت کی سیاست اور گاؤں کی سطح پر ہونے والے سماجی تضادات کو حقیقت پسندانہ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ ناطق نے اپنے مشاہدے اور دیہی زندگی کے تجربات کو بڑے فنکارانہ انداز میں بیان کرتے ہوئے ایک ایسی دنیا کو قاری کے سامنے رکھا ہے جہاں معاشی و سماجی ناہمواری اپنی پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ دوسری جانب، بانو قدسیہ کا **"راجہ گدھ"** اردو ناول کی تاریخ میں ایک سنگِ میل ہے جس میں انہوں نے فرد کی اخلاقی اور روحانی زندگی کو سماجی مسائل کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ یہ ناول انسانی جبلت، حلال و حرام کی کشمکش، معاشرتی بے راہ روی اور اخلاقی زوال جیسے اہم مسائل کو نہایت گہرائی اور وسعت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اکیسویں صدی کے سماجی تناظر میں یہ دونوں ناول اردو ناول نگاری کی نئی جہات کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک طرف ناطق کا ناول طبقاتی اور سیاسی مسائل کی کھوج لگاتا ہے تو دوسری جانب بانو قدسیہ کا ناول انسان کی داخلی دنیا، اس کے اخلاقی بحران اور سماج کے رویّوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس طرح یہ دونوں ناول نہ صرف اپنے اپنے دور کی آئینہ دار تخلیقات ہیں بلکہ اکیسویں صدی کے اردو ناول میں سماجی مسائل کی عکاسی کے حوالے سے ایک مضبوط حوالہ بھی فراہم کرتے ہیں۔

علی اکبر ناطق کا شمار اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو ناول نگاروں میں معتبر مانا جاتا ہے۔ ان کے دو ناول ”نو لکھی کوٹھی“ اور ”کماری والا“ اردو ناول نگاری کے دامن کو وسعت بخش چکے ہیں جس کی وجہ ان کا غصب کا مشاہدہ ہے۔ ناطق کے نالوں میں حقیقی زندگی کی سچی اور کھری تصویر ملتی ہے جس سے وہ اپنے ناولوں میں زندگی کی ناہمواریوں اور سماج کی بے حسی کو ظاہر کرتے ہیں۔ علی اکبر ناطق نے اپنے نئے ناول ”کماری والا“ میں پنجاب کی سرزمین سے مضبوط رشتے کی وضاحت کی ہے جس کے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ”ان کے فکشن میں پنجاب کی سرزمین میں غیر معمولی دلچسپی ان کے بیان میں غیر معمولی مہارت کا ثبوت دیتی ہے۔“(۴)

”کماری والا“ ناول میں علی اکبر ناطق نے کئی موضوعات کو شامل کیا ہے جس میں سماجی عکاسی اور سرکاری اداروں میں ہونے والی بد دیانتی سر فہرست ہیں۔ سرکاری اداروں میں کام کرنے والے ملازم خدا بن کر عوام سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ سرکاری املاک کو لوگ ذاتی ملکیت سمجھ کر برتاؤ کرتے ہیں۔ ناول میں ایک کردار جلال دین گاؤں کی سرکاری ڈسپنسری میں ملازم ہوتا ہے جو کہ مجرمانہ ذہنیت کا مالک ہے۔ ڈسپنسری کے دیگر عملے کو بھی اسی راہ پر لگا کر دونوں ہاتھوں سے عوام کا مال کھاتے ہیں۔ یہ ہمارے سماج کا ایک بنیادی مسئلہ ہے جس میں کم و بیش ہر عہدے والا فرد اپنا حصہ ڈالتا رہتا ہے۔ چوری چکاری، دو نمبری اور فراڈ ہمارے سماج کے ایسے مسائل ہیں جن سے عام معاشرہ بہت متاثر ہوتا ہے۔ جلال دین بھی اسی فراڈی کا شکار ہے اور ڈسپنسری کی ادویات چوری کر کے بلیک مارکیٹ میں فروخت کر دیتا ہے جبکہ مریض ایڑیاں رگڑتے ہوئے مالکِ حق سے جا ملتے ہیں۔

> ”ڈسپنسری میں حکومت کی طرف سے ملنے والی مفت دوائیاں جلال دین شہر میں جا کر دوبارہ بیچ آتا اور اس سے ملنے والے پیسے لوگوں کو ادھار دیتا ہے۔۔ نرس اور جلال دین آپس میں ملے ہوئے ہیں اور ساری دوائیاں بیچ دیتے ہیں۔۔۔ ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ اس کام میں ملوث تھا بلکہ جو بھی نیا ڈاکٹر آتا جلال دین اس کی آنکھوں کا تارا بن جاتا۔“(۵)

سماج کے دیگر مسائل کا ایک اہم سبب شراب نوشی ہے۔ یہ انسان کے دماغ کو مختل کر کے اسے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتی ہے اس وجہ سے شراب کو 'ام الخبائث' کہا گیا ہے۔ شراب نوشی کی لت میں مبتلا شخص ملک و ملت کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ سماج پر بوجھ ہوتے ہیں بلکہ انہیں معاشرے کا ناسور کہا جائے تو بہتر ہے۔ شراب نوشی کرنے والا شخص دیگر جرائم میں مبتلا ہو کر معاشرے کا حسن گہنا دیتا ہے۔ وہ چوری چکاری، ڈکیتی اور قتل و غارت گری جیسے جرائم کر کے شراب نوشی کے لیے مالی تعاون حاصل کرتا ہے۔ ناول ”کماری والا“ میں بھی شراب نوشی جیسے کریہہ فعل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو سماج کا اہم مسئلہ ہے۔ جلال نامی کردار ڈسپنسری میں آنے والی الکوحل کو اپنے جرائم پیشہ دوست کے ساتھ مل کر پیتا ہے۔ دونوں نہ صرف شراب نوشی کرتے ہیں بلکہ قومِ لوط کی طرح ہم جنس پرستی جیسے قبیح فعل کو بھی گاؤں کے ایک لڑکے شمیر کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

> ”اسی کے ساتھ ایک کریہہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوا۔ شمیر چارپائی پر الٹا لیٹا تھا اور یہ ننگا تھا۔ اس کے ساتھ جلال دین بھی محض نیکر پہنے لیٹا تھا اور دنوں ایک دوسرے کے ساتھ الجھے ہوئے تھے۔۔۔ ابھی میری دہشت جاری تھی کہ عین اسی کوارٹر کے ایک کمرے سے وہی یونس نامی آدمی باہر نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ وہ بھی الف ننگا تھا اور ہاتھ میں ایک بڑی سی شیشی

تھی۔ اس کا ننگا جسم انتہائی کریہہ لگ رہا تھا۔ پیٹ پر بڑھا ہوا گوشت سور کی چربی کی طرح لٹک رہا تھا۔ یہ بڑی مونچھوں والا جلال دین سے بھی بڑھ کر خوفناک اور گندا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بھی اسی بڑی چارپائی پر ان کے ساتھ لیٹ گیا۔ پھر دونوں مل کر شمیر کو چمٹ گئے۔"(۶)

کوئی بھی سماجی برائی کو انسان کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ وہ کہیں کا نہیں رہتا اور سماج میں اس کی عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ نشے اور جوئے میں مبتلا انسان اپنے خونی رشتوں کی پہچان بھول جاتا ہے کیونکہ اس کا خون سفید ہو جاتا ہے۔ "کماری والا" کا ایک کردار معیز جوئے اور نشے کی لت میں مبتلا ہے اور اپنی لت کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنے نانا اور نانی کو قتل کر دیتا ہے۔ ذہنی بے حسی اور نشے کی عادت مل کر انسان کو اس قدر ظالم بنا دیتی ہیں کہ وہ ذہنی تسکین کے لیے اپنوں کی قربانیاں پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا ہے۔ جوئے کی لت میں مبتلا اشخاص جو بعض اوقات اپنی بیوی اور بیٹی تک کو شرط میں ہار جاتے ہیں۔ محمد اشرف ملک اس صورتحال کو ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

"ایک حاجت مند نشے کا عادی، جب نشے سے ٹوٹا ہوا ہو، جیب خالی اور غم روزگار سے بھی دل شکستہ ہو تو ایسے عالم میں اس کے لیے ادھر ادھر سے رقم بٹورنے یا آمادہ جرم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ جب تک وہ مکمل نشے کی حالت میں ہو، تو وہ اپنی ہی دھن میں خیالات کی دنیا میں کھویا رہتا ہے ۔۔۔ افراد خاندان کے لیے وہ باعث مصیبت اور ننگ و ناموس بن جاتا ہے۔ تہذیبی ضابطوں کی پرواہ کیے بغیر وہ حصول نشہ کے لیے رقم فراہم کرنے پر تل جاتا ہے۔ اخلاق سوز حرکات کے باعث احساس کمتری جنم لیتی ہے۔"(۷)

ہمارے سماج کا سب سے بڑا مسئلہ جاگیردارانہ نظام ہے جس میں ایک شخص مالک جب کہ باقی سب اس کی رعایا میں شمار ہوتے ہیں۔ مہذب معاشرے کا یہ دوغلا چہرہ اس قدر زیادہ کریہہ ہے کہ تہذیب یافتہ لوگ اس بات پر یقین کرنے سے منکر ہوتے ہیں کہ اونچے شملے اور خوش مزاج شخص کے چہرے کے پیچھے کا منظر کتنا مکروہ ہے۔ ایسے لوگ زر، زن اور زمین کی ہوس میں خونی رشتوں کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ ناول میں ایک کردار احمد بخش کا ہے جو اپنے چھوٹے بھائی صادق بخش کو زمین کے لیے قتل کرا دیتا ہے۔ بعد میں وہ اس قتل کو سڑک حادثے کا رخ دے کر چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ کچھ عرصے بعد احمد بخش کا بیٹا طلال اپنے دوسرے چچا الٰہ بخش کو بھری عدالت میں قتل کرا دیتا ہے۔ اس مسئلے کو ناطق نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ فطے اوڈ نے اپنی قمیص کے نیچے سے دیسی لوہار کے ہاتھ سے بنا ہوا وہ طمنچہ نکال لیا جس میں ایل جی کارتوس پڑتا تھا۔ یہ کارتو اس اتنا سخت اور زوردار تھا کہ ایک بھینسے کو مارنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے الٰہ بخش کے دل کے اوپر رکھ کر گھوڑا دبا دیا۔ وہاں ایک ایسا دھماکہ ہوا کہ تمام عدالت کانپ اٹھی۔ جج بھاگ کر اپنے کمرے میں گھس گیا اور ہر طرف ہڑبونگ مچ گئی۔ اتنے میں فطے اوڈ نے کمرے کو کنڈی لگا دی تاکہ الٰہ بخش کے گارڈ اندر نہ آ جائیں۔"(۸)

ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ یہاں **مذاق اور ثقافت کے نام پر برائیوں کو نہ صرف جنم دیا جاتا ہے بلکہ انہیں فروغ بھی دیا جاتا ہے۔** کئی بااثر اور نامور شخصیات اپنے اقتدار اور شہرت کی آڑ میں ایسے گھناؤنے کام کرتی ہیں جو معاشرتی اقدار کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ طاقت اور سرپرستی کے زور پر فحاشی کے اڈے قائم کیے جاتے ہیں، اور ان میں ملوث افراد اپنے جرائم کو سماجی

سرگرمیوں یا ثقافتی میلوں کے لبادے میں چھپا کر پیش کرتے ہیں۔ یہی وہ عوامل ہیں جو رفتہ رفتہ معاشرتی اخلاقیات کو زوال کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیلتے ہیں۔ علی اکبر ناطق نے اپنے ناول **"کماری والا"** میں اس حقیقت کو نہایت جراتمندی اور فنی مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انہوں نے ایسے کردار تراشے ہیں جو پروڈکشن ہاؤس کے پردے میں جسم فروشی کا گھناؤنا کاروبار چلاتے ہیں۔ یہ میاں بیوی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو جھانسہ دے کر اپنے جال میں پھنساتے ہیں۔ پہلے انہیں روزگار اور شہرت کے سنہرے خواب دکھائے جاتے ہیں، پھر ان سے فحش فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ بعد ازاں یہی فلمیں ان نوجوانوں کو بلیک میل کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور انہیں مجبوری کے تحت بیرونِ ملک اسمگل کر کے جسم فروشی کے اندھے کنویں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ان شیطانی کھیلوں میں ملوث افراد کا انجام بھی اسی دلدل میں ڈوب کر ہوتا ہے جسے وہ دوسروں کے لیے بچھاتے ہیں۔ "کماری والا" میں پیش کردہ یہ منظرنامہ ہمارے سماج کے ایک انتہائی کڑوے سچ کی عکاسی کرتا ہے۔ آج فحاشی اور جسم فروشی ہمارے معاشرتی ڈھانچے کا ایسا ناسور بن چکی ہے جو صرف غریب یا کمزور طبقے تک محدود نہیں رہا بلکہ تعلیم یافتہ اور بااثر گھرانوں تک پھیل چکا ہے۔ اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت نے نئی نسل کو بے راہ روی کی طرف مائل کر دیا ہے۔

سماجی سطح پر ایک اور تلخ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں شادی اور ازدواجی زندگی کو بلاوجہ مشکل بنا دیا گیا ہے۔ غربت، جہیز کی لعنت، روزگار کی کمی اور دیگر رکاوٹوں کی وجہ سے اکثر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تیس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ کنوارے رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب فطری ضرورتیں جائز ذرائع سے پوری نہیں ہوتیں تو ان کا رخ ناجائز اور غیر فطری راستوں کی طرف ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زنا، بدکاری اور دیگر جنسی برائیاں عام ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ اس بات کا ثبوت ہے کہ سماج نے اپنی بنیادوں کو نظر انداز کر دیا ہے اور اخلاقی اقدار کو محض کتابوں یا تقریروں تک محدود کر دیا ہے۔ یوں علی اکبر ناطق کا ناول **"کماری والا"** محض ایک ادبی تخلیق نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کے اندر پھیلے ہوئے ان جرائم اور برائیوں کا بے لاگ نوحہ ہے جو بظاہر چھپے رہتے ہیں مگر اصل میں ہزاروں زندگیوں کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ یہ ناول قاری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ سوچے کہ آخر ہمارا معاشرہ کس سمت جا رہا ہے اور ان بیماریوں کا علاج کیا ہے۔ اس ضمن میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

> فحاشی نام ہے ہر اس طریق عمل کا جو قانون قدرت یا سوسائٹی کے مقرر کردہ اصولوں کے خلاف خواہش نفس کو پورا کرنے کے لیے اختیار کیا جائے اور اس میں وہ صورت بھی شامل ہے جس کا تعلق کسب زر سے ہے اور جسے عصمت فروشی کہتے ہیں۔" (۹)

سماج میں ایسے جنسی واقعات کی بھرمار ہے جن میں مجرم اپنے شکار کی عمر، جنس، مقام و مرتبہ اور صنف کی پہچان کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا بلکہ اس کی نفسانی خواہش اسے اس قدر اندھا کر دیتی ہے کہ وہ سماج کو زک پہنچانا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ادبی جاذبیت اور چاشنی موجود ہے۔ وہ اپنے زبان و بیان میں سادگی و سلاست سے کام لیتے ہیں۔ ان کے اسلوب کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> "ناطق کی نثر سے مکالمہ اور بیانیہ کے نامانوس گوشوں پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ناطق کے فکشن کا قاری خود انسان اور فطرت کے پیچیدہ رشتوں، انسان اور انسان کے درمیان محبت اور آویزش سے بہرہ اندوز ہوتا ہوا دیکھ سکتا ہے۔" (۱۰)

ناطق نے "کماری والا" لکھ کر اردو ادب میں خاطر خواہ مثبت اضافہ کیا ہے۔ اس ناول میں کئی سماجی برائیوں جیسے ہم جنس پرستی، بے ایمانی، شراب نوشی، جوا، جسم فروشی اور دیگر معاشی و سماجی برائیوں کو بیان کیا ہے۔ اکیسویں صدی کے دوسری اہم ناول نگار بانو قدسیہ ہیں۔ بانو قدسیہ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کا شاہ کار ناول "راجہ گدھ" اکیسویں صدی کے اہم سماجی مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔ عصرِ جدید میں خالص انسان کی پہچان مشکل ہو چکی ہے۔ چہار سو نفسا نفسی کا دور دورہ ہے اور بھائی بھائی سے دست ِ گریباں ہے۔ "راجہ گدھ" موضوعاتی اعتبار سے نفسیاتی اور علامتی تخلیق اظہار کے جدید پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے۔ معاشرے کے مسائل کو سچائی اور ایمانداری سے سامنے لانے میں بانو قدسیہ نے کسی طرح کی کسر نفسی سے کام نہیں کیا ہے۔ "راجہ گدھ" کے کے متعلق ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> "بانو قدسیہ کا ناول "راجہ گدھ" ایک ایسے دور میں سامنے آیا جب ہمارے معاشرے میں ذات کی شکست و ریخت، اخلاقی زوال اور بے سمتی کا نمایاں احساس ہے۔ یہ احساس اس پر آشوب دور میں اس بات کی علامت ہے کہ ہمیں اس امر کا ادراک ہو چکا ہے کہ ہماری اقدار اندر سے اس قدر گل سڑ چکی ہیں کہ اگر صورتحال میں تبدیلی کا اہتمام نہیں کیا گیا تو معاشرہ اپنی موت سے ہم کنار ہو جائے گا جس کا صریحاً مطلب یہ ہو گا کہ انسان زبردست ارتقاء کے باوجود اپنی ذات کے ہاتھوں شکست کھا چکا ہے جبکہ جبکہ طور پر وہ ہدایت کی خواہش کر تا رہا ہے۔"(۱۱)

بانو قدسیہ نے اپنے اس ناول میں سماجی مسائل کا ایک نچوڑ پیش کیا ہے کہ ہر سماجی مسئلہ اور دقیق صورتحال تب پیدا ہوتی ہے جب کوئی غیر اخلاقی، غیر فطرتی اور غیر اسلامی محرک کار فرما ہو۔ اس ناول کے کرداروں میں قیوم، پروفیسر سہیل، سیمی شاہ اور آفتاب کے علاوہ امتل و دیگر کردار ہیں۔ ہر کردار منفرد مقام رکھتا ہے اور فنی اعتبار سے مکمل ہے۔ ناول کا آغاز سوشیالوجی کی کلاس کے ایک تعارفی لیکچر سے ہوتا ہے جس سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ سیمی شاہ جو کہ ایک بیوروکریٹ کی بیٹی ہے کلاس کی سب لڑکیوں میں منفرد اور ذہین ہے۔ اس کی تربیت آزاد خیال معاشرے میں ہوئی اور سوچنے و سمجھنے کی آزادی اس کی گھٹی میں موجود ہے۔ آفتاب کے افکار سے متاثر ہو کر وہ اسے اپنا دل دے بیٹھتی ہے لیکن وہ انکار کر دیتا ہے۔ آفتاب سے بچھڑ کر اس کی حالت شکست خوردہ انسان سی ہو گئی اور وہ ٹوٹ گئی جسے بانو قدسیہ ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔

> "دراصل آفتاب سے بچھڑ کر سیمی کشش ثقل سے آزاد ہو گئی تھی۔۔۔ لیکن کشش ثقل سے آزاد رہنے کے بعد جو بے سمتی پیدا ہوتی ہے اس سلسلے میں اسے کوئی باقاعدہ ٹریننگ نہ ملی تھی۔ وہ گویا ان دنوں مافیا تلے سانس لے رہی تھی۔ جہاں بیٹھ جاتی پہروں بیٹھی رہتی۔ کہیں جب اس کی نظر جم جاتی تو پھر چینی کی گڑیا کی طرح اس طرف دیکھتی جاتی۔ ایسے میں آفتاب کے نام کے علاوہ اور کوئی ٹیکہ کارگر نہ ہوتا۔ اس خلائی دور سے کئی کیفیتیں وابستہ ہوئیں۔ خود ترسی، بیزاری، تنہائی پسندی، مردم گزیدہ محرومی غرض یہ کہ افتاب کی کشش باقی نہ رہی تو کئی سمتیں پیدا ہوئیں۔۔۔ لیکن ہر سمت کے آگے ہمیشہ خلا ہوتا، خاموشی ہوتی۔۔۔۔ اندر کا پریشر بڑھتا چلا جاتا۔"(۱۲)

سماج میں کچھ لوگ اس قدر کمزور ہوتے ہیں کہ ان کی اپنی کوئی ارادی قوت باقی نہیں رہتی ہے۔ وہ جس سے کس قدر بات کر لیں وہ سچائی، نیک نیتی اور خلوص پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لیے معاشرہ اور دیگر سماجی واقعات سے نتائج کا ماحصل ان کی خود اعتمادی کو چھین

لیتا ہے۔ آفتاب سے بچھڑ کر اسے قیوم نے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی قیوم کا اپنا مقصد پنہاں تھا۔ اس کی محبت ہوس اور نفس پر مبنی تھی جب کہ سیمی اس سے مختلف تھی۔ وہ ہر وقت آفتاب کی یادوں میں مگن رہتی ہے۔ عشق لاحاصل نے سیمی شاہ کو ایسی صورت حال سے دوچار کر دیا جس پر اسے کوئی اختیار نہ رہا اور وہ خودکشی کی طرف مائل ہو گئی۔ سیمی کی پاک محبت کا ایک ہی مقصد تھا جسے دردِ دل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ وہ قیوم کا شکریہ ان الفاظ میں کرتی ہے۔

> ”شکر ہے لاہور میں تم ہو قیوم۔۔۔ اگر تم نہ ہوتے تو میں آفتاب کی باتیں کس سے کرتی۔ تم میری بڑی ضرورت بن گئے ہو قیوم۔۔۔ سچی میں کسی حیدر کے ساتھ اب نہیں رہ سکتی۔۔۔ کیا کسی وقت آفتاب بھی مجھے اسی شدت سے یاد کرتا ہو گا۔“(۱۳)

وطن عزیز میں شروعاتی برسوں میں جو طبقاتی کشمکش رائج ہوئی سیمی کا المیہ اسی کشمکش کا ثمر تھا۔ معاشرے کے اونچے درجے میں جو تضاد ملتا ہے سیمی بھی اسی کا شکار بنی اگرچہ وہ صرف ایک عکس ہے۔ اس کے پاس روایات، اقدار، تعلقات سے کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔ ماں باپ، دوستوں اور چہار سو سے اُمڈتی مایوسی نے اسے ایک بند گلی میں دھکیل دیا جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہ ملا۔ قیوم کا کردار ”راجہ گدھ“ ناول میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایسے افراد کا نمائندہ ہے جو کمزور اور پسے ہوئے طبقات میں آنکھیں کھولتے ہیں۔ زندگی کی بے کسی اور آسائشات کی آرزو میں ناکامی کا سامنا انہیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ناول میں قیوم کے الفاظ ہیں:

> ”اسکول سے بھاگ جانے والے بچوں کی جگہ سکول میں نہیں ہوتی لیکن ایسے ہی باغی بچوں کو بنچ پر کھڑا کر کے ہمیشہ ان عظیم شخصیتوں کی روشن مثالیں دی جاتی ہیں جو خود سکولوں سے بھاگے تھے۔۔۔۔ میرے دل کی بنچ پر ماسٹر غلام رسول کے ساتھ کئی قدر آور شخصیتیں کھڑی تھیں۔ اسی تضاد کے باعث میں عمر بڑھنے کے باوجود اندر سے نہ بڑھ سکا اور میری شخصیت ایک ایسے درخت جیسی ہو گئی جیسے زیبائش کے لیے جاپان میں پالا جاتا ہے، جو سالوں پرانا ہوتا ہے لیکن جس کا قد ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔“(۱۴)

ہماری سماجی صورتحال انتہائی ناگفتہ بہ ہونے کی وجہ سے قیوم جیسے کردار عام ملتے ہیں۔ معاشی بحران کا شکار معاشرہ اچھے استاد اور فتح مند مبلغ پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ قیوم کو ابتدائی سالوں میں وہ پرورش نصیب نہ ہوئی جو ابتدائی زندگی میں مناسب تربیت اور رہنمائی سے ملتی ہے۔ اس کی طبیعت میں احساس کمتری کا عنصر انہی سماجی مسائل کی بدولت در آیا جو بچپن سے وہ سہتا رہا۔ اس نے نہ صرف اسے کمزور اور لاچار کیا بلکہ وہ دوسروں کو بھی برباد کرتا رہا۔ اسے پڑھانے والے اساتذہ تک تضادات کا شکار رہے جس کی وجہ سے قیوم الجھنوں سے بچنے کی بجائے گہرائی میں چلا گیا۔ وہ کہتا ہے:

> ”میرا خیال تھا کہ اگر آنکھوں کے راستے دل میں داخل ہونے کا راستہ نہ ہو تو دل تک جانے کے اور بھی کئی راستے ہو سکتے ہیں۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ دل کو صرف ایک راہ جاتی ہے اور وہ جسم کا راستہ نہیں ہے۔“(۱۵)

سیمی کی وفات کے بعد قیوم ایک ایسے ہیجان اور اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے نکلنے کی اس کے پاس کوئی سبیل نہیں رہتی۔ اگرچہ اس کی زندگی میں دوسری عورتیں بھی موجود رہی ہیں اور اس نے ان کے ساتھ محض جسمانی تعلقات قائم کیے تھے، لیکن ان سب میں سے سیمی کا مقام منفرد تھا۔ سیمی اس کے لیے صرف ایک عورت نہیں بلکہ ایک ایسی کمزور رگ تھی جس نے

اسے بار بار اپنی طرف کھینچا۔ وہ اس کی ایسی محبت تھی جس پر وہ اپنا مکمل حق جتانا چاہتا تھا۔ قیوم نے سیمی کے جسم پر تو قبضہ کر لیا لیکن اس کی روح کو چھونے اور اس کے دل کو جیتنے میں ہمیشہ ناکام رہا۔ یہی ناکامی اسے اندر ہی اندر بے سکون اور مضطرب کرتی رہی۔ قیوم کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ سیمی نہ صرف اس کے ساتھ رہے بلکہ دل سے بھی اسے تسلیم کرے۔ مگر سیمی کی شخصیت میں ایک ایسی خود مختاری اور داخلی مضبوطی تھی جو قیوم کے قابو میں نہ آ سکی۔ قیوم نے سیمی کی چاہت حاصل کرنے کے لیے کئی جتن کیے۔ وہ اس کے قریب آنے کے لیے خود کو آفتاب کے روپ میں پیش کرتا ہے، تاکہ سیمی کے دل میں اپنی جگہ بنا سکے۔ مگر اس کی یہ اداکاری اور بناوٹی پن زیادہ دیر نہ چھپ سکا۔ سیمی نے ہمیشہ اس کے وجود کے اس رخ کو پہچان لیا جو محض جسمانی خواہشات کا اسیر تھا اور روحانی یا جذباتی رشتے سے محروم۔ قیوم کی زندگی میں سیمی کی موت ایک شدید خالی پن پیدا کر دیتی ہے۔ وہ جسے اپنے جسمانی اور نفسیاتی وجود کا مرکز سمجھتا تھا، وہ اچانک اس سے چھن گئی۔ اب وہ خود کو ایک ایسی گہری تنہائی میں پاتا ہے جہاں اس کی تمام عیاشیاں اور دوسری عورتوں سے تعلقات بھی اس خلا کو پُر کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ سیمی کی محبت کی کمی اور اس کے دل کو نہ جیت سکنے کا غم قیوم کو اندر ہی اندر کھاتا جاتا ہے۔ وہ جتنا سیمی کی یاد سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتا ہے اتنا ہی اس کی گرفت میں جکڑتا چلا جاتا ہے۔ اس تڑپن کا اظہار وہ یوں کرتا ہے:

> "میں نے خفگی سے کہا۔۔۔ہم بھی تو ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں سیمی، ہمیں کوئی محبت تھوڑی ہے۔۔۔۔۔۔ قیوم؟۔۔۔۔۔۔ ہیں قیوم۔" (۱۶)

پروفیسر سہیل قیوم کی حالت دیکھ کر اسے یوگا کرنے کا مشورہ دیتا ہے لیکن اس سے بھی قیوم کی صحت پر فرق نہیں پڑتا۔ قیوم ایک شادی شدہ عورت عابدہ سے بھی تعلقات استوار کرتا ہے لیکن یہ تعلق بھی اس کی ذہنی خلش کو دور نہیں کر پاتا۔ وہ السر، اینگزائٹی اور ڈپریشن کے اٹیک کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنی ذہنی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> "صبح شیو کرتے مجھے اپنی شکل یوں نظر آتی جیسے روشنی کی سفید کرن طیف منشوری میں سے نکل کر سات رنگوں میں بدل جاتی ہے۔ سادہ شیشے میں میری شکل کئی شکلوں میں منتقل ہو جاتی۔ کسی عکس میں مونچھ غائب ہو جاتی کسی حصے میں بامیز بادشاہ جیسی داڑھی نظر آتی۔ کبھی کبھی اوپر والے ہونٹ پر لپ سٹک کا لیپ ہوتا۔ ناک میں چھوٹی سی نتھنی ہوتی۔ کبھی کسی چہرے کی آنکھیں غائب ہو جاتیں۔ آئینے میں نظر آنے والی صورتوں میں سے خوف زدہ ہو جاتا۔ پھر میں الماری کھول کر اندر دیکھتا۔ مجھے یقین تھا کہ الماری میں ٹرنک کے اندر گدھے کے نیچے مجھ سے مشابہ کئی بونے رہتے ہیں اور کسی دن مجھے اکیلا پا کر وہ مجھ پر اچانک حملہ آور ہو جائیں گے۔" (۱۷)

قیوم اس جنونی حالت پر قابو پانے کے لیے روشن نامی لڑکی سے بیاہ کرتا ہے لیکن جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکی ماں بننے والی ہے تو اسے پانچ دن بعد طلاق دے دیتا ہے۔ قیوم کی یہ صورتحال اخلاق کے دیوالیہ پن نکلنے کی داستان ہے۔ وہ جنسی بے راہ روی کا شکار رہتا ہے جو ہمارے سماج کا تلخ مسئلہ ہے جس سے ہر کوئی نظریں تو چرا لیتا ہے لیکن دل ہی دل میں بعض لوگ اس کی مذمت کرتے ہیں تو بعض چسکے لیتے ہیں۔ وہ عشق لاحاصل کا شکار ہوا۔ اسے سیمی نہ مل سکی جس کی وجہ سے وہ ذہنی پسماندگی کا شکار ہو گیا۔ اس عشق لاحاصل نے اس کے حصے میں فقط منفیت وارد کی۔ اس نے اسی منفی راہ میں اطمینان قلب کی تلاش چاہی لیکن اس کی تمام حیات محرومیوں سے لبریز تھی۔ جس دیوانگی نے اسے جنسی بے راہ روی کا شکار کیا وہ اسے انجام تک روحانی سکون کے لیے استعمال کرتا رہا لیکن

سب بے سود رہا۔ اس کی فطرت میں مردار خوری غالب رہی اور یہی بانو قدسیہ کے ناول "راجہ گدھ" کا بنیادی موضوع ہے۔ بانو قدسیہ نے طوائف الملوکی کے شکار معاشرے کے ایک اور سماجی مسئلے طوائفوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ امتل کا کردار ایک طوائف کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کی ملاقات قیوم سے اتفاقاً ریڈیو اسٹیشن پر ہوتی ہے۔ امتل جس ماحول میں پرورش پاتی ہے وہاں جسم اور روح محض جنسی آسودگی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں دلوں کو شکار کرنا ایک مشغلہ سمجھا جاتا ہے۔ ماضی میں امتل کو استحصال کا نشانہ بنا پڑا اور جب جوانی گزری تو اس کے بیٹے کو یہ راز معلوم ہوا اور اس نے اپنی ماں کو قتل کر دیا۔ امتل کے مکالموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ موت اس کی خواہش کے عین مطابق ہوئی:

"اور تم نے کیا دعا مانگی ہے امتل؟ بس یہی۔۔۔۔۔ یہی سر جی زندگی تو کسی پیار والے کے ساتھ گزری نہیں۔ اب موت تو کسی پیارے کے ہاتھوں آئے۔۔۔ موت تو حلال ہو میری۔"(۱۸)

پروفیسر سہیل کا کردار بھی ناول میں اہم ترین ہے۔ ناول کے پلاٹ میں پروفیسر سہیل اہم جزو کا مقام رکھتے ہیں۔ کوثر کے ذریعے علم ہوتا ہے کہ وہ بھی قیوم اور سیمی شاہ کی طرح محبت کا شکار ہیں۔ ایک جگہ پر وہ اعتراف کرتے ملتے ہیں کہ ان کے کہنے پر ہی آفتاب سیمی سے دوری اختیار کرتا ہے۔ اس کی وجہ ان کے مطابق یہ تھی کہ سیمی میں وفا کا مادہ موجود نہیں ہے کیونکہ وہ ایک ایسے معاشرے میں پروان چڑھی ہے جہاں مدر پدر آزادی کا تصور موجود ہوتا ہے۔ اسلوب احمد انصاری، سہیل کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سہیل کے کردار کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ سماجیات اور سائنس کی دنیاؤں کے خاک چھاننے کے بعد روح کی کائنات کی تفتیش اور جستجو میں منہمک ہو جاتا ہے اور بعض غیر تقلیدی نظریات کا اظہار شد و مد اور بھرپور ایمان و اتفاق کے ساتھ کرنے لگتا ہے۔ اس کا حتمی خیال ہے کہ جسم کی کثافت روح کو بھی کثیف اور غیر مظہر بنا کر چھوڑتی ہے۔"(۱۹)

ناول میں بنیادی طور پر دو پلاٹ استعمال ہوئے ہیں۔ ہر دوسرے باب میں بانو قدسیہ نے جانوروں کی کانفرنس کو موضوع بنایا ہے۔ یہ تمثیلی کردار انسانوں سے مماثلت رکھتے ہیں اور "راجہ گدھ" کی مردار کھا کر پیدا ہونے والی دیوانگی بھی ناول میں موضوع کی شکل اختیار کرتی ہے۔ بانو قدسیہ نے ایک نظریہ پیش کیا کہ عشق لاحاصل آرزوؤں کی تلاش میں بشر اپنا تشخص کھونے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے صحیح سمت کا بھی ادراک نہیں کر سکتا۔ ایسی خواہشات انسان کو ذہنی و فکری طور پر مفلوج کر دیتی ہیں۔ لاحاصل خواہشات چاہے محبت کی ہوں، دولت کی ہوں یا حرام رزق کی تمام ایک کی صورت میں پنپتی ہیں۔ انسان کو سماجی مسائل سے نکلنے کے لیے بانو قدسیہ نے تصوف کا سہارا لینے کا پیغام دیا ہے۔ پروفیسر سہیل کے الفاظ میں:

"تم کو اپنے آپ کو کوئی سمت دینی ہو گی ۔۔۔۔۔ کوئی مشن اپنانا پڑے گا، کوئی گول، کوئی منزل۔۔۔۔ ورنہ تم خالی بجرے کی طرح سمندری لہروں میں بھٹکو گے۔ کبھی بحر قلزم میں، کبھی بحیرہ عرب میں۔۔۔۔ اپنے ارد گرد دیکھو۔۔۔۔۔ جو لوگ زندگی میں کوئی مشن بنا لیتے ہیں، چاہے چھوٹے سے چھوٹا کیوں نہ ہو، وہ السر کا شکار نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ پیغمبروں کی زندگی کو غور سے دیکھو، وہ بڑی سے بڑی قربانی دے کر بھی السر کا شکار نہیں ہوتے۔۔۔۔ کوئی ٹریجڈی انہیں ہلا نہیں سکتی۔۔۔۔ بے نام جستجو، بے مصرف تلاش نہ ہو۔۔۔۔ زندگی میں ایک مشن ہو، چاہے بالکل

چھوٹا سا۔ مثلاً بہتر کینو کا باغ لگانا۔۔۔۔پاکستان کے لیے نئی قسم کی گندم بونا۔۔۔۔ پلاسٹک کی ڈوری سے قالین بننا۔۔۔ کسی بچے کو سی ایس پی کرانا۔۔۔۔ بھائی میرے۔۔۔۔۔ بیمار ذہن کے مالک، کسی کے فائدے کے لیے مشن نہیں ہوتا۔۔۔۔اس کا فایدہ ہمیشہ مشن والے کو ہوتا ہے۔۔۔۔ بڑے سے بڑا مشن ہو کائناتی قسم کا تو آدمی اللہ کا پیارا بن جاتا ہے۔ گھٹیا کو الٹی کا آدم سائز ہو تو اپنے آپ کو آرام و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔"(۲۰)

پروفیسر سہیل کی شخصیت کے ذریعے جس سماجی مسئلے کی جھلک ملتی ہے وہ محض ان کا ذاتی مسئلہ نہیں بلکہ ہمارے تعلیمی اور سماجی ڈھانچے کا ایک نہایت سنگین اور الم ناک پہلو ہے۔ ہمارے معاشرے میں استاد، جو کبھی عزت و وقار کی علامت اور رہنمائی کا استعارہ سمجھا جاتا تھا، آج اپنے مقام و مرتبے کے بحران کا شکار ہے۔ وہ نہ تو وہ عزت و احترام پاتا ہے جو ایک معلم کا بنیادی حق ہے اور نہ ہی اسے تدریسی آزادی میسر ہے کہ وہ بغیر کسی خوف یا دباؤ کے تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دے سکے۔ اس صورتِ حال کا سب سے بڑا نتیجہ عدم اعتماد اور مایوسی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، جو استاد اور طالب علم کے رشتے کو بھی متاثر کرتا ہے اور تعلیمی نظام کے وقار کو بھی مجروح کرتا ہے۔ یہی بحران اس وقت شدت اختیار کرتا ہے جب پروفیسر سہیل جیسا باوقار اور فرض شناس استاد محض اس خوف کا شکار ہو کہ اگر کلاس روم میں طلبہ شور شرابہ کریں اور نظم و ضبط متاثر ہو تو کہیں انتظامیہ اس پر الزام نہ لگا دے اور اسے ملازمت سے محروم نہ کر دے۔ کلاس روم کا یہ منظر نامہ، جس میں پروفیسر سہیل اپنے طلبہ کو محض یہ کہہ کر خاموش ہونے کی تلقین کرتے ہیں کہ "آواز نیچی رکھیں تا کہ یونیورسٹی سے نہ نکالا جاؤں"، ہمارے تعلیمی اداروں اور معاشرے کی ایک بھیانک حقیقت کو آشکار کرتا ہے۔ یہ حقیقت یہ ہے کہ استاد اپنے مقام سے اتنا محروم ہو چکا ہے کہ وہ علم کی ترسیل اور تربیت کے بجائے اپنی نوکری کی بقا کی فکر میں الجھا ہوا ہے۔

یہ صورتِ حال نہ صرف استاد اور شاگرد کے درمیان اعتماد کی دیوار کھڑی کرتی ہے بلکہ پورے نظامِ تعلیم کو بھی کھوکھلا کر دیتی ہے۔ جب استاد خوف اور دباؤ کے ماحول میں تدریس کرے گا تو اس کے علم کی تاثیر بھی کم ہو گی اور شاگرد کی تربیت بھی ادھوری رہے گی۔ نتیجتاً ایک ایسا سماج وجود میں آئے گا جہاں تعلیم محض ایک رسمی عمل بن کر رہ جائے گی، جس میں نہ تو کردار سازی ہو گی اور نہ ہی فکری تربیت۔ پروفیسر سہیل کے کردار میں ہمارے معاشرتی رویوں کا وہ انتہائی الم ناک عکس جھلکتا ہے جس میں استاد کو عزت دینے کے بجائے اس پر الزام تراشی اور دباؤ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس سے نہ صرف استاد کی شخصیت مجروح ہوتی ہے بلکہ طلبہ بھی اس رویے سے سبق لیتے ہیں کہ استاد ایک کمزور اور بے اختیار فرد ہے جس کی بات کو نظر انداز کرنا آسان ہے۔ یہ رویہ مستقبل کی نسل کو بھی عدم اعتماد، بد تہذیبی اور بے نظمی کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ بانو قدسیہ نے حلال و حرام کا فلسفہ اور حرام و حلال رزق کے انسانی جسم پر اثرات کے تصور کو پروفیسر سہیل کی زبانی بیان کیا ہے:

"مغرب کے پاس حلال حرام کا تصور نہیں ہے اور میری تھیوری ہے کہ جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی جینز کو متاثر کرتا ہے۔ رزق حرام سے ایک خاص قسم کی Mutation ہوتی ہے جو خطرناک ادویات، شراب اور Radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ رزق حرام سے جو جینز تغیر پذیر ہوتے ہیں وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ ناامید بھی ہوتے ہیں

۔ نسل انسانی سے یہ جینز جب نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان Genes کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل بن کہتے ہیں۔ یقین کرلو رزق حرام سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے اور جن قوموں میں من حیث القوم رزق ہے حرام کھانے کا لپکا پڑ جائے۔ مومن حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہیں۔"(۲۱)

ناول کو اختتام کی طرف کے جاتے ہوئے ایسا کردار تخلیق کیا گیا ہے جو دیوانگی کے محبت رخ کا ظاہر کرتا ہے۔ آفتاب کی وطن واپسی اس کے بیٹے الباہیم کے ساتھ ہوتی ہے۔ ابراہیم ایسی دیوانگی کا شکار ہے جو نہ تو عشق لاحاصل سے حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی کسی اور جذبے سے بلکہ یہ ایسی دیوانگی ہوتی ہے جسے مصنفہ مقدس کہتی ہے۔ پاک رزق اور جس کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہو اس سے پیدا ہوئی یہ دیوانگی رب کی عنایت ہوتی ہے۔ ممتاز احمد خان لکھتے ہیں۔

"ناول میں بانو نے انسان کی تخلیق، اس کے ذہنی و فکری ارتقا اور اس کی جنسی نفسیات، اس کی تہذیب اور مذہب اور تصوف کے حوالوں سے کائنات میں اس کے مقام سے بحث کی ہے، مگر ان سب باتوں کا تانا بانا وہ فکری لحاظ سے تصوف و روحانیت سے جوڑ دیتی ہیں اور اپنے ایک اہم کردار پروفیسر سہیل کی وساطت سے قاری پر یہ تاثر چھوڑتی ہیں کہ ہمارے تمام تر معاشرتی عوارض کا حل روحانیت میں پوشیدہ ہے اور یہ کہ ہماری بد اعمالیوں اور مغربی فلسفوں نے ہماری روح پر جو زخم ڈالے ہیں ان کا علاج فرائڈ کے نسخوں میں نہیں ملے گا کیونکہ اس کا طریقہ علاج روحانیت کو انسانی ذات سے خارج کر کے وضع کیا گیا ہے۔"(۲۲)

"راجہ گدھ" میں مصنفہ نے جن سماجی مسائل کی عکاسی کی ہے وہ ہماری سماجی زندگی کے کثیر معاملات میں سماجی انتشار پیدا کرتے ہیں۔ دولت کی ہوس ہو یا پھر عہدوں کا لالچ، رشوت، جنسی ہیجان، اقدسر سے روگردانی، بے راہ روی، عدم مساوات، دوسروں کے حقوق غصب کرنا، عدم اطمینان جیسی بے شمار سماجی برائیاں انتشار پھیلاتی ہیں۔ معاشرے میں تقدس کا نام ونشان نہیں اور مسائل کا گرداب سماج کی جڑوں کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ تعلیم کا فقدان اور صحیح خطوط پر پرورش نہ کرنا ہے۔ محکمہ انصاف عوام کو انصاف فراہم کرنے سے قاصر ہے اور انصاف کی اس عدم دستیابی نے سماجی مسائل کو مزید بڑھاوا دیا ہے۔

اکیسویں صدی بجا طور پر انتشار، بدامنی اور تضادات کی صدی کہی جا سکتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس نے انسان کو روز افزوں تبدیلیوں کے ایسے بھنور میں لا کھڑا کیا ہے جہاں وہ اپنی اصل اقدار سے کٹ کر صرف اپنی ذات اور مفادات کے گرد گھومنے لگا ہے۔ تیز رفتار ترقی اور سائنسی ایجادات نے اگر ایک طرف سہولتیں پیدا کی ہیں تو دوسری جانب انسان کو اس قدر خود غرض اور مصلحت پرست بنا دیا ہے کہ وہ جان بوجھ کر اخلاقیات اور سماجی اقدار کو پامال کرتا ہے تاکہ اپنی وقتی آسائش یا شخصی فائدہ حاصل کر سکے۔ معاشرتی ناہمواری، خود غرضی، رشوت، کرپشن، فحاشی، بیروزگاری، طبقاتی تقسیم، دہشت گردی اور اقتدار کی ہوس ایسے مسائل ہیں جنہوں نے موجودہ انسان کو نہ صرف اضطراب اور پریشانی میں مبتلا کیا ہے بلکہ پورے سماج کو ایک مسلسل انتشار کی کیفیت میں جکڑ رکھا ہے۔ اسی پس منظر میں اردو ناول نگاروں نے اپنے عہد کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ معاشرے کے اس بکھرے ہوئے منظرنامے کو محض

بیان نہیں کرتے بلکہ اس کی جڑوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناول چونکہ زندگی کی آئینہ دار صنف ہے اس لیے اکیسویں صدی میں یہ صنف سماجی مسائل کی عکاسی کے لیے سب سے مؤثر ذریعہ بن کر ابھری ہے۔ ناول نگاروں نے فرد اور سماج کے باہمی رشتے کو موضوع بنایا اور دکھایا کہ کس طرح انسان اپنے ہی پیدا کردہ مسائل کی دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں پیش کیے گئے سماجی مسائل اردو ناول کے آغاز و ارتقاء سے کسی قدر مختلف ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی ناولوں میں جو مسائل زیرِ بحث تھے وہ محدود اور کسی حد تک مذہبی و اخلاقی اصلاح تک سمٹے ہوئے تھے، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب سماج نے نئی شکل اختیار کی تو اس کے ساتھ جرائم اور مسائل نے بھی نئی جہات حاصل کر لیں۔ آج کے ناولوں میں وہ مسائل زیادہ نمایاں ہیں جو عالمی سطح پر تہذیبی، ثقافتی اور معاشی دباؤ کے باعث پیدا ہوئے ہیں، مثلاً سرمایہ دارانہ نظام کی سختیاں، بے روزگاری، سماجی انصاف کی کمی، جنسی جرائم، تانیثیت کے سوالات، ماحولیاتی بحران اور ثقافتی انحطاط وغیرہ۔ اکیسویں صدی کا سماج اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ناول نگار کے لیے ایک وسیع کینوس فراہم کرتا ہے۔ ایک طرف تعلیم، ٹیکنالوجی اور ذرائع ابلاغ نے نئی جہتیں پیدا کی ہیں تو دوسری طرف یہی عوامل اخلاقی زوال اور معاشرتی بے راہ روی کا سبب بھی بنے ہیں۔ ان تمام تضادات نے انسانی زندگی کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا ہے کہ ناول نگار کو ان سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ معاصر اردو ناول میں زندگی کا کوئی پہلو اظہار سے خالی نہیں ہے۔ خواہ وہ فرد کی داخلی کشمکش ہو، خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ، سیاسی ناانصافی، طبقاتی جبر، مذہبی انتہاپسندی یا عالمی سطح پر پھیلنے والی بے یقینی — ہر موضوع کو ناول نگاروں نے نہ صرف چھوا بلکہ گہرائی کے ساتھ برتا بھی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ راجندر ناتھ شیدا، ادب فکر اور سماج، ص:۷
۲۔ نعیم انیس، ڈاکٹر، اکیسویں صدی میں اردو ناول، ص:۱۲
۳۔ ہم عصر اردو ناول ایک مطالعہ مرتبہ: قمر رئیس و علی احمد فاطمی نئی دہلی ص:۱۵
۴۔ شمس الرحمان فاروقی، نولکھی کوٹھی، از علی اکبر ناطق، فلیپ، جہلم بک کارنر، ۲۰۲۰ء
۵۔ علی اکبر ناطق، کماری والا، جہلم، بک کارنر، ۲۰۲۰ء، ص:۴۱
۶۔ ایضاً، ص:۱۴۲۔۱۴۳
۷۔ محمد اشرف ملک، مبادیات جرمیات، علم جرم فلسفہ جزا و سزا، لاہور، الکوثر پبلیکیشنز، ۱۹۶۸ء، ص:۱۹۱
۸۔ علی اکبر ناطق، کماری والا، جہلم، بک کارنر، ۲۰۲۰ء، ص:۱۴۲۔۱۴۳
۹۔ نیاز فتح پوری، ترغیبات جنسی یا شہوانیات، لاہور، آواز اشاعت گھر، ۲۰۰۴ء، ص:۱۰
۱۰۔ شمس الرحمان فاروقی، نولکھی کوٹھی، از علی اکبر ناطق، فلیپ، جہلم بک کارنر، ۲۰۲۰ء
۱۱۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اُردو ناول کے بدلتے تناظر، کراچی، ویلکم بک لمیٹڈ، ۱۹۹۳ء، ص:۱۹۴
۱۲۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص:۱۷۰

۱۳۔ ایضاً، ص:۱۴۳۔۱۴۴

۱۴۔ ایضاً، ص:۱۸

۱۵۔ ایضاً، ص:۱۲۳

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۲۶

۱۷۔ ایضاً، ص:۳۸۶

۱۸۔ ایضاً، ص:۱۸۵

۱۹۔ انصاری، اسلوب احمد، اردو کے پندرہ ناول، علی گڑھ، ایجو کیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۲ء، ص:۳۲۷

۲۰۔ ایضاً، ص:۲۷۶

۲۱۔ ممتاز احمد خان، راجہ گدھ۔ نظریاتی کمٹمنٹ کا ناول، (مشمولہ) اردو ناول کے بدلتے تناظر، کراچی، ویلکم بک پورٹ لمیٹڈ
، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص:۲۶۸